⊙ ڈاکٹر عبدالعزیز ملک
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد
⊙ ڈاکٹر سمیرا اکبر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد
⊙ ڈاکٹر رابعہ سرفراز
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

ڈاکٹر وزیر آغا: امتزاجی تنقید کا نمائندہ نقاد

Abstract:

Dr. Wazir Agha was a prominent literary critic and writer, known for his work in the field of literary criticism. He was considered one of the pioneers of the "New Criticism" movement in Pakistan which emphasized the close reading of literary texts and the analysis of their formal structures. As a synthetic critic, Dr. Wazir Agha believed in the idea that literary criticism should not be limited to a particular theory or approach but should instead be a synthesis of various critical perspectives. He believed that the role of a critic was to engage with a literary work from multiple angles, and to consider the various ways in which the work could be interpreted. According to Dr. Agha, a synthetic critic should be able to combine the insights of different critical approaches, such as formalism, structuralism, post-structuralism, and psychoanalysis, in order to provide a comprehensive understanding of a literary work. He argued that by adopting a synthetic approach, critics could avoid the limitations of any one particular theory and offer a more nuanced and sophisticated interpretation of a text.

Keywords:

Criticism, Critic, Theory, Synthetic, New Criticism, Multiple angles

ڈاکٹر وزیر آغا اردو تنقید کے ایسے نقاد ہیں جنھوں نے تقلید کے بجائے اِختراع کی روِش اختیار کی۔ اُنھوں نے تہذیب و کلچر کے علاوہ نفسیات، فلسفہ، تاریخ اور دیومالا کے زاویوں سے اردو ادب کو پرکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے دیومالا کے ذریعے انسان کی صدیوں پرانی تہذیب تک رسائی حاصل کر کے اُن آرکی ٹائپ کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے جو انسانی ذہن کا حصہ بن گئے ہیں۔ یہ آرکی ٹائپ لاشعوری طور پر ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اجتماعی لاشعور کی مدد سے متعدد فنکاروں کی تخلیقات کا مطالعہ کیا اور عام روش سے ہٹ کر نتائج اخذ کیے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا تنقیدی سفر خاصا طویل ہے۔ جس میں ''اُردو ادب میں طنز و مزاح''، ''مَسرت کی تلاش''، ''اُردو شاعری کا مزاج''، ''اِنشائیہ کے خدوخال''، ''تخلیقی عمل''، ''نظمِ جدید کی کروٹیں''، ''عبدالرحمان چغتائی: شخصیت اور فن''، ''تصوراتِ عشق و خرد: اِقبال کی نظر میں''، ''تنقید اور جدید اُردو تنقید''، ''تنقید اور اِحتساب''، ''تنقید اور مجلسی تنقید''، ''معنی اور تناظر'' اور ''تنقیدی تھیوری کے سو سال'' جیسی کتب بطورِ خاص نمایاں ہیں۔

اردو ادب کی تہذیبی اور ثقافتی جڑوں کی تلاش کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا نے مابعد جدید ادبی فکر کے فروغ میں بھی بنیادی کردار ادا کیا۔ انھوں نے بیسویں صدی کے آخری عشرے میں ساختیاتی تنقید پر تواتر سے مضامین قلم بند کیے۔ ۱۹۸۷ء سے لے کر ۱۹۸۹ء تک انھوں نے رسالہ ''اوراق'' کے اداریوں میں ساختیاتی تنقید کے بارے میں لکھا۔ جدید اور مابعد جدید تنقید کے حوالے سے ان کی کتب بھی منظرِ عام پر آئیں جنھوں نے اُردو تنقید میں جدید مباحث کو متعارف کرانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اِن میں ''ساختیات اور سائنس''، ''تنقید اور جدید اُردو تنقید''، ''معنی اور تناظر''، ''امتزاجی تنقید کا سائنسی اور فکری تناظر'' اور ''تنقیدی تھیوری کے سو سال'' زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے جدید تنقیدی رجحانات کا تعارف کراتے ہوئے شازیہ عمیر لکھتی ہیں:

> ''ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید کا مطالعہ کیا جائے تو جس طرح انھوں نے مغربی تھیوریز یعنی روسی فارمل ازم، نئی تنقید، متھ تنقید، ساختیات پس ساختیات، نوتاریخیت کی حامل تنقید اور امتزاجی تنقید کے ابعاد پر گفتگو کی ہے اور اس کے پس منظر میں لسانیات، دیومالا، نفسیات، فلسفہ، مارکس ازم، طبیعیات، حیاتیات اور انفارمیشن تھیوری کا ادراک کیا ہے۔ نیز مشرقی دانش سے بھی اسے آمیز کرنے کی کاوش کی ہے اور عملی تنقید کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ غور کریں تو یہ سارا عمل امتزاج سے عبارت ہے، مگر اسے مختلف نظریات و افکار کا ملغوبہ قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ امتزاج ایک ایسی ساخت ہے جس میں متعدد افکار و نظریات ایک خاص ترتیب سے ہم رشتہ ہو کر ایک نئے نظریے کی تخلیق پر منتج ہو گئے ہیں۔''(۱)

مذکورہ نظریات کے حوالے سے دیکھا جائے تو صرف ڈاکٹر وزیر آغا ہی نہیں دیگر ناقدین نے بھی ان نظریات کو اپنی تنقید کا جزو بنایا ہے۔ حالی و شبلی سے لے کر حسن عسکری، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمان فاروقی اور وہاب اشرفی تک ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے جدید نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے نہ صرف اردو تنقید کے دامن کو وسیع کیا بلکہ اسے اعتبار بھی بخشا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ اُنھوں نے خود کو تھیوری کے کسی ایک پہلو سے منسلک

نہیں کیا بلکہ اس کے تدریجی ارتقاء کو غیر وابستہ ناقد کی نظر سے دیکھا۔اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے امتزاجی تنقید کی با ضابطہ تشکیل کی۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو انھیں دیگر جدید ناقدین کی صف میں نمایاں مقام عطا کرتی ہیں۔اُنھوں نے مختلف علوم سے استفادہ کیا ہے۔اُن کے فکری سرچشموں کو کسی ایک مکتبہ فکر کے ساتھ منسلک نہیں کیا جا سکتا۔اُنھوں نے مشرقی و مغربی افکار کا بنظرِ عمیق مطالعہ کیا۔وہ،مشرقی ومغربی افکار کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ مغرب سے قطع تعلق کیے بغیر مشرق کے علمی سرمایے کو مشعلِ راہ بنایا جائے۔وہ امتزاج کے قائل ہیں جو ان کی پہلی تصنیف ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' سے ہی نمایاں ہونا شروع ہو جاتا ہے۔اس کے نقوش وقت کے ساتھ ساتھ مزید نمایاں ہوتے گئے۔یہی رویہ ان کی پہلی فلسفیانہ اور رومانی کتاب ''مَسرت کی تلاش'' میں بھی دکھائی دیتا ہے۔اس سوال کا جواب جاننے کے لیے کہ دنیا جو مَسرت کی تلاش میں ہمہ وقت سرگرداں ہے،آخر اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ کیا چیز ہے؟اس کا جواب تلاشنے کے لیے انھوں نے مغربی اور مشرقی علوم سے استفادہ کیا ہے۔مَسرت کی ماہیت کو سمجھتے سمجھتے وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خوشی یا مَسرت تو انسان سے دور نہیں ہے بلکہ خود انسان تصنع کاری،حرص و ہوس اور غلط کاریوں کی وجہ سے اس سے دور ہوتا جاتا ہے۔انسان اپنی حرکات سے گریز کرے کے بجائے الٹا ''فطرت'' کو موردِ الزم ٹھہراتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا تنقید میں امتزاج کے قائل ہیں۔انھیں امتزاج میں حسن دکھائی دیتا ہے۔غور کریں تو کائنات میں تنوعات کا غیر مختتم سلسلہ نظر آتا ہے۔ ہر شے اپنے اپنے دائرے میں قید ہے۔سورج،چاند،ستارے اپنے اپنے مدار میں گھوم رہے ہیں۔حیرت کی بات ہے کہ کہیں تصادم پیدا نہیں ہوتا۔تصادم کا پیدا نہ ہونا توازن کی مثال ہے۔اسی توازن کو وہ حسن سے تعبیر کرتے ہیں۔ان کے خیال میں متنوع اور متضاد اشیاء کے باہم توازن اور امتزاج سے حُسن وجود میں آتا ہے۔''حُسن'' ہمیشہ توازن،ہم آہنگی اور امتزاج سے صورت پذیر ہوتا ہے۔اسی طرح مظاہرِ قدرت کے پسِ پشت توازن اور امتزاج کی رو موجود ہوتی ہے جسے ایک طرح کے اسرار کا نام دیا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں عام صوفیا اس اسرار کو حقیقتِ عظمیٰ تصور کر لیتے ہیں اور خاص صوفیا کے لیے یہ مقامِ سدرہ ہے۔ان کی منزل اس سے کہیں زیادہ ہے جہاں حقیقتِ عظمیٰ موجود ہے۔اسی کے نور کے پرتو سے تنوعات کو قوتِ توازن عطا ہوتی ہے۔اسی تصور کے تناظر میں ڈاکٹر وزیر آغا کی تھیوری کو معرضِ تفہیم میں لایا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا تصوف اور فلسفے سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ایک مکالمے میں وہ کہتے ہیں:

> ''ایک تخلیق کار کا عملِ تخلیق بجائے خود شعور اور لاشعور،جبر اور قدر کے امتزاج کی صورت ہے۔مگر اسے محض امتزاج کہہ دینے سے غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے کیوں کہ ایک تو یہ جست یا Jump کے ذریعے ہوتا ہے،دوسرا نراج کی حالت سے برآمد ہوتا ہے۔''(۲)

غور کریں تو ایک سالک جب سلوک کی راہیں طے کرتا ہے تو وہ درحقیقت تنوعات کی دنیا سے توازن اور ہم آہنگی کی جانب سفر طے کر رہا ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم آہنگی اور امتزاج صوفی کے مزاج کا حصہ ہے۔امتزاجی تنقید کے تصور کو واضح کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں:

> ''امتزاجی تنقید سے مراد یہ ہے کہ نقاد کے علم اور مطالعے کا دائرہ وسیع ہو اور وہ جملہ تنقیدی زاویوں

سے فن پارے کا جائزہ لینے پر قادر ہو''۔(۳)

ادیب اپنی قوتِ متخیلہ کو بروئے کار لاتے ہوئے جب فن پارے کی ترتیبِ نو قائم کرتا ہے تو اس کی تخلیق میں متعدد علوم اپنے الگ الگ رنگوں کے باجود ایک ہی رنگ میں ڈھل جاتے ہیں۔ جیسے سورج کی روشنی سات رنگوں پر مشتمل ہوتی ہے، لیکن کلیت میں دیکھا جائے تو ایک ہی رنگ کا اظہار ہوتی ہے۔ نقاد جب فن پارے کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ تخلیقِ نو کے کرب سے گزرتے ہوئے لطف اٹھاتا ہے۔ اس لمحے ہر رنگ اس پہ کھلتا چلا جاتا ہے۔ نقاد کا کام پیچیدگی کے ساتوں رنگوں کو سامنے لانا ہے۔ وزیر آغا کے ہاں یہی رویہ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔

امتزاجی تنقید کو مغربی تنقیدی روایت کے تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک رجحان کے ردِعمل کے طور پر دوسرا پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد تیسرا منظرِ عام پر آتا ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ گزشتہ رجحانات کو امتزاجی صورت میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ مغربی تنقید میں اس کی مثال سانت بیو سے دی جا سکتی ہے۔ وہ شروع میں رومانی تحریک سے وابستہ تھا۔ بعد ازاں وہ اس سے الگ ہو گیا۔ جمیل جالبی کے بقول ایک طرف وہ رومانیت کی جذبات پرستی، عدم توازن اور انتہا پسندی کو استرداد کرتا ہے تو دوسری جانب ان کے جذبہ اثر کی قدر بھی کرتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی امتزاجی جہت سانت بیو کے برعکس باقاعدہ ایک نظام ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے امتزاجی نظریہ مشرقی ادب سے کشید کیا ہے۔ انھیں مشرقی ادب کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات اور لحہ بہ لحہ رونما ہونے والی تبدیلیوں کی بھی خبر تھی۔ اس لیے انھوں نے اس کا ادراک بروقت کر لیا۔ اس ضمن میں محمد رفیع از ہر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر وزیر آغا نے ادب کے امتزاجی روپ کو وقت کے روزن سے بہت پہلے جھانک لیا تھا۔ اس لیے وہ پہلے تخلیقی ادب یعنی انشائیے کی طرف بڑھے... انشائیہ ایک ایسی صنف کہ جسے (فرانس) کے کسی نابغہ نے قبل از وقت پہچان لیا تھا، اس کا ادعا بھی کیا تھا، لیکن وہاں کے ادباء اسے سنبھال نہ سکے اور اس سے پہلے کہ وہ زمانے کی گرد میں دب جاتا، ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے ازسرِ نو تازگی بخشنے کے لیے مطلوبہ ماحول اور فضا کے ساتھ ساتھ وافر ادبی آلات بھی مہیا کر دیے اور آج انشائیہ اُردو ادب کی پہچان ہے۔''(۴)

امتزاجی تنقید کے نقطہ نظر سے وہ یہ لازمی خیال کرتے ہیں کہ تنقیدی عمل میں فن پارے کا کوئی پہلو نظر انداز نہ ہونے پائے۔ ڈاکٹر وزیر آغا عقیدے کے خلاف نہیں لیکن اس کو کسوٹی تصور کر لینا، محدود اور تنگ نظر ہونے کی دلیل ہے۔ ان کے خیال میں ایک عظیم فن کار اپنی فطری نمو کے راستے میں کوئی بند نہیں باندھتا۔ وہ اِسے آزاد فضا میں پھیلنے کی اجازت دیتا ہے۔ ادب کی تخلیق کے سلسلے میں اس کی کوئی قید نہیں ہے کہ ادیب نے اس میں کس عقیدے کا اظہار کیا ہے یا کسی نظریے کو پیش بھی کیا ہے یا نہیں۔ تنقید میں صرف یہ دیکھا جانا ضروری ہے کہ اس میں جو کچھ بھی پیش کیا گیا ہے اس میں خلوص اور فن کی صورتِ حال ہے۔ فن کار کے ہاں تخلیقی عمل توانا ہے یا نہیں۔ کیا اسے اظہار و ابلاغ پر دسترس حاصل ہے۔ اگر یہ تقاضے پورے ہو رہے ہیں تو اسے ادب کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

ساختیات اور پس ساختیات کے حوالے سے ان کے خیالات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ

ساختیات کا تصور محض لسانی ماڈل تک محدود نہیں ہے۔اس کا دائرہ کار جملہ معاشرتی علوم تک پھیلا ہوا ہے۔ساختیات بیسویں صدی کی حاوی فکر کے طور پر موجود ہے جو طبیعیات، فلکیات، حیاتیات اور علوم کی دیگر شاخوں تک پھیلی ہوئی ہے۔اس نے رشتوں اور رشتوں کے نظام کو اوّلیت دی ہے۔ساختیات سے پہلے اشیاء کو اہم خیال کیا جاتا تھا اب اشیاء کے رشتوں کو اہمیت دی جانے لگی۔ساختیات کے تصور سے پہلے انیسویں صدی کے ربع آخر میں تاریخی اور سوانحی تنقید اپنے عروج پر تھی۔ماٰخذ کی تلاش، معاشرتی تناظر کا مطالعہ، ادب کی تاریخ اور مصنف کی سوانح پر زور دیا جاتا تھا۔پہلے پہل علامت نگاری کی تحریک، پھر روسی ہئیت پسندی کی تحریک اور آگے چل کر نئی تنقید کی تحریک نے ادب کو براہِ راست مرکزِ نگاہ بنایا۔نئی تنقید کے بنیادگزاروں میں ٹی ایس ایلیٹ کا نام نمایاں ہے جس نے مصنف کی شخصیت کے انہدام کا مؤقف اختیار کیا۔درحقیقت یہ اس رویّے کے خلاف ردِعمل تھا، جس میں مصنف، اس کے سوانحی کوائف اور تاریخی حیثیت کو اوّلیت دی جاتی تھی۔اس کے بعد ولیم ایمپسن اور آئی اے رچرڈز نے اس تسلسل کو برقرار رکھا اور نئی تنقید میں اضافے کیے۔ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے میں بیسویں صدی کی تنقید میں دوسرا اہم رویہ رولاں بارتھ کے خیالات کے توسط سے داخل ہوا۔رولاں بارتھ کا خیال ہے کہ متن کو مصنف تخلیق نہیں کرتا بلکہ متن اپنے آپ کو خود تخلیق کرتا ہے۔اس سے پہلے ٹی ایس ایلیٹ نے مصنف کو تو نہیں اس کی شخصیت کو فن پارے سے الگ کیا تھا، رولاں بارتھ نے تو مصنف کو ہی متن سے الگ کر دیا۔رولاں بارتھ نے سوسئیر کے ہی اس موقف کو آگے بڑھایا جس میں زبان کے پس پشت ایک نظام ہوتا ہے جو زبان کے جملہ رویوں کو گرفت میں رکھتا ہے۔زبان میں گفتار کا عمل اسی نظام کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔وہ متن کی تخلیق کاری میں لانگ سے زیادہ شعریات کو اہمیت دیتا ہے اور یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ متن کو مصنف نہیں شعریات تخلیق کرتی ہے۔اس طرح بارتھ نے تحریر کے حوالے سے مصنف کو منہا کر دیا۔بیسویں صدی میں تیسرا اہم رویہ اس وقت سامنے آیا جب دریدا نے یہ موقف اختیار کیا کہ معنی کی کوئی دائمی اور مستقل حیثیت موجود نہیں۔وہ ہر سطح پر ملتوی ہوتا چلا جاتا ہے۔یوں معنی کی حتمیت اور قطعیت سے انکار کیا گیا۔دریدا کے نزدیک معنی کے ملتوی ہونے کا سارا سلسلہ ایک طرح کا گورکھ دھندا ہے، جو ''فری پلے'' کی صورت میں ہویدا ہوتا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ دریدا نے حقیقت کو تکثیریت اور التوا کا حامل قرار دیا ہے۔اس نے واحد معنی کو فکشن اور تکثیریت اور التوا کو اصل حقیقت جانا ہے۔بیسویں صدی کے منظرنامے کو دیکھا جائے تو مغربی تنقید نے شخصیت کو منہا کیا، مصنف پر خطِ تنسیخ کھینچا اور واحد معنی کو فکشن کہہ کر اسے ہمہ وقت ملتوی ہوتے دکھایا۔ڈاکٹر وزیر آغا نے ان تمام رجحانات کو اپنی تنقید کا حصہ بنایا۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے جہاں ثقافتی اور تاریخی تناظر کو اہم تصور کیا وہاں اُنھوں نے سائنسی پیش رفت کو بھی تنقیدی تھیوری کی بنیاد بنایا۔ان کی تحریروں میں جا بہ جا سائنسی حوالے موجود ہیں۔وہ اکثر اوقات اپنے تنقیدی نظریے کو بھی کسی سائنسی نظریے کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔بیسویں صدی میں سائنسی تصورات میں تیزی سے تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ان تبدیلیوں کے اثرات معاشرتی زندگی پر بھی مرتسم ہو رہے تھے۔یہ اثرات لوگوں کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ ان کی طرزِ فکر میں تغیر کا باعث بن رہے تھے۔ادب چوں کہ زندگی سے جُڑا ہوتا ہے اس لیے یہ ناممکنات میں سے ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کا اثر قبول نہ کرے۔وزیر آغا اس بات کے قائل ہیں کہ ادب کو فنون اور معاشرتی سائنسوں کے ساتھ

ساتھ براہِ راست بھی خالص سائنس سے استفادہ کرنا چاہیے۔اس کی مثال ان کی کتاب ''تخلیقی عمل'' سے دی جاسکتی ہے کہ جس میں انھوں نے حیاتیات کے نظریہ تقلیب (Mutation) یا Bicameral Mind کے تصور کو استعمال کیا ہے۔وزیر آغا اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''جب خالص سائنس میں کوئی پیش رفت ہوتی ہے تو سب سے پہلے معاشرتی سائنس اس سے استفادہ کرتی ہے۔پھر مختلف فنون اسے اپناتے ہیں۔ادب اور ادبی تنقید کی باری آخر میں آتی ہے۔''(۵)

ڈاکٹر وزیر آغا ادبی تنقید میں سائنسی نظریات کے استعمال کے قائل ہونے کے باوجود اس بات کے خواہاں ہیں کہ تنقید کو سائنسی علوم سے اتنا بوجھل نہ ہونے دیا جائے کہ عوام الناس کی سمجھ سے بالاتر ہو جائے۔ادب میں لوگ زیادہ تر شاعری سے متاثر ہوتے ہیں۔اس لیے تنقیدی تخلیق بھی شاعری کی طرح احساساتی ہو تو زیادہ قابلِ فہم اور دلچسپ ہو گی۔اس بات کا اظہار معروف فرانسیسی نقاد سانت بیو نے بھی اپنے تنقیدی نظریات میں کیا تھا۔ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی جب سائنسی نظریات کو ادبی تنقید کا حصہ بنایا تو انھوں نے تنقید کو بوجھل نہیں ہونے دیا۔مثلاً جب انھوں نے حیاتیات کے نظریہ تقلیب کو اپنے تخلیقی نظریہ جست کی بنیاد بنایا تو اس میں ثقالت پیدا نہیں ہونے دی۔ان کے نظریہ جست کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے لاشعور میں کئی مشاہدات اور تجربات مجتمع ہوتے رہتے ہیں جو کسی خاص لمحہ میں شعوری خیالات سے متصادم ہو کر انتشار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔پھر اچانک تخلیق جست بھر کر نمایاں ہو جاتی ہے۔اسی طرح جب وہ Bicameral Mind کو تنقیدی عمل میں استعمال کرتے ہیں تو مشکل پیدا نہیں ہوتی بلکہ تخلیقی عمل کی تفہیم میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ان کا خیال ہے کہ انسانی دماغ دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔دایاں دماغ اور دوسرا ہے بایاں دماغ۔دایاں دماغ پرانا دماغ بھی کہلاتا ہے جو وہبی قوت کا حامل ہے۔بایاں دماغ نیا دماغ ہے جو منطقی طاقت کا حامل ہوتا ہے۔ان دونوں حصوں کے مابین ایک دیوار یا پردہ ہے جسے کارپس کلوسم سے جانا جاتا ہے۔اس دیوار کو عام آدمی عبور نہیں کر پاتا۔جب کہ صوفی یا تخلیق کار عبور کر جاتا ہے۔اس نظریے کو ادب میں استعمال کرتے ہوئے انھوں نے احساساتی انداز کو مدِ نظر رکھا ہے۔

وزیر آغا نے خیال ظاہر کیا کہ لسانیات نے بیسویں صدی میں طبیعیات کے میدان میں ہونے والی پیش رفت سے اثرات قبول کیے۔سائنسی دریافت خالص سائنس کی صورت میں سامنے آتی ہے۔پھر اس کے اثرات گاہ گاہے معاشرے پر مرتسم ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔یہیں سے تنقید کے لیے اخذ و انتخاب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ادبا شعوری یا لاشعوری طور پر اس سے استفادہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔غور کریں تو بیسویں صدی میں ساختیات اور ردِ تشکیل نے مرکز کے تصور کو منہدم کیا اور اس کی جگہ پیٹرن کو دی۔یہ اثر درحقیقت نیوٹن کی فزکس سے جدید فزکس کی جانب پیش رفت کا نتیجہ تھا۔ساختیاتی فکر ''کل'' یا ''کلیت'' کے تصور کی قائل ہے جو ماڈرن فزکس سے مماثل ہے۔اسی لیے ڈاکٹر وزیر آغا ساختیات کو مابعد الطبیعیات اور تصوف سے جا ملاتے ہیں۔ان کے خیال میں ساختیات نے کل اور جز اور وحدت و کثرت کی جس تقسیم کی نشان دہی کی ہے وہ صوفیانہ مسلک کے عین مطابق ہے:

> ''یہ وہ مقام ہے جہاں طبیعیات اور تصوف اور نشان فہمی حقیقت کے ادراک میں ایک ہی زاویہ نگاہ

کو بروئے کار لاتے دکھائی دیتے ہیں.....جدید طبیعیات کے مطابق کائنات مادی اجزا کا مرکب نہیں بلکہ مختلف رشتوں کے ربطِ باہم کا نام ہے۔خود ناظر بھی انھی رشتوں میں سے ایک ہے۔تصوف اور طبیعیات کی طرح ساختیاتی تنقید میں قاری یا ناقد تحریر کو پڑھتے ہوئے تحریر میں شامل ہو جاتا ہے۔''(۶)

وزیر آغا نے محسن عزیز کے ساتھ ایک مکالمے میں بھی اسی بات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''بیسویں صدی کے آغاز میں آئن سٹائن کے نظریہ اضافت اور پلانک کے کوانٹم طبیعیات کی شروعات ہوئی اور Atomism کی جگہ رشتوں کے جال (Web of Relation) نے لے لی تو اس سے نفسیات، علم الانسان، لسانیات، موجودیت، تاریخ حتیٰ کہ سیاست تک متاثر ہوئی۔بیسویں صدی سے قبل مرکز یعنی Center کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔اسے مختلف علوم اور مذاہب میں مختلف نام ملے تھے۔مثلاً: Presence-Essence-Logos - Being وغیرہ فلسفے میں، دھرما کیہ، بدھ مت میں، تاؤ، تاؤ مت میں، برہم، ہندو مت میں، ایرن اکرن، زرتشت کے نظریے میں وغیرہ''۔(۷)

ساختیات کے بعد ردِتشکیل کا تصور جب منظرِ عام پر آیا تو انھوں نے اسے بھی مذہبی تصورات کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی۔وزیر آغا کے نزدیک صورِ اسرافیل ردِتشکیل کی بہترین ترجمانی ہے۔اس کی پہلی آواز دنیا کو Deconstruct کرے گی اور دوسری آواز اسے از سرِ نو تخلیق کرے گی۔غور کریں تو تصوف کا بنیادی مؤقف بھی یہی ہے کہ پہلے توڑا جائے اور پھر اسے ارفع سطح پر تعمیر کیا جائے۔ردِتشکیل بھی یہی کام کرتی ہے۔وہ دریدا کی ردِتشکیل کا تعلق اکتشافی تنقید سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ردِتشکیل اور دیگر پس ساختیاتی نظریات سے استفادہ کرنے کے باوجود ڈاکٹر وزیر آغا مرکزیت پر یقین سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتے۔معاشرتی سائنسوں نے لامرکزیت سے ہی سے زیادہ اثرات قبول کیے تھے اس لیے وہاں مرکز گریز رجحانات کا عمل دخل زیادہ نظر آتا ہے۔مغرب کی علمی تاریخ کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ نٹشے نے خدا کی موت کا اعلان کیا۔لیکن ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے ہو بہو قبول نہیں کیا۔وہ مغربی نظریات میں سے ایسے نکات نکال لاتے ہیں جن سے کسی نامعلوم مرکز کی نشان دہی ہوتی ہے۔مثلاً لامرکزیت کے تصور سے وحدت الوجودی عناصر تلاش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بیسویں صدی میں کوانٹم طبیعیات نیز لسانیات، سوشیالوجی اور نفسیات میں ہونے والی پیش رفت نے ایک ایسی سائنسی ساخت کا تصور ابھارا جو لامرکزیت کی حامل تھی یعنی ایک ایسی ساخت جو رشتوں کا ایک جال تھی اور جس کا ہر نقطہ ہی مرکزہ تھا۔یہ ایک طرح کا وحدت الوجودی نظریہ بھی تھا جو جز کو کل سے الگ تصور نہیں کرتا، اگر فرق تھا تو بس ایک تصوف نے کل اور جز کے رشتے کو دجلہ اور قطرہ یا چکنی مٹی اور ظروف رشتہ مانا تھا جبکہ بیسویں صدی کی ساختیات نے لانگ اور پیرول کا رشتہ قرار دیا۔اب معاشرتی سطح کے حوالے سے کہا جانے لگا کہ افراد (پارول کی طرح)،

معاشرے (یعنی لانگ) سے ہم رشتہ ہیں، اور نفسیاتی سطح کے حوالے سے یہ کہ انسانی شعور کے جملہ مظاہر (پارول) کی بنت میں لاشعور (لانگ کے طور پر) کارفرما ہے۔''(۸)

مذکورہ بالا اقتباس میں حقیقت عظمیٰ سے انکار کی بجائے اقرار کا رویہ سامنے آ رہا ہے۔ مزید اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ساختیات کا تصور مشرقی نظریہ تصوف سے ہی اخذ کیا گیا ہے کیوں کہ جز اور کل میں گہری مماثلت موجود ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا تنقید میں سائنسی نظریات اور ان کے ادب اور معاشرے پر پڑنے والے اثرات کے منظر نامے سے واقف ہیں۔ سائنس میں جو تغیرات رونما ہوئے اور جو علوم ان سے متاثر ہوئے اس سے وہ آگاہ ہیں۔ اس پورے تناظر میں تنقید نے کس حد تک سائنس سے اکتساب کیا اس کا بھی انھیں ادراک ہے۔

پاکستان میں ساختیات اور مابعد جدید عناصر کو فروغ دینے میں ڈاکٹر وزیر آغا کا کردار بنیادی نوعیت کا ہے۔ ان کی تنقیدی تحریریں ادب یا اس کے مسائل کی حد تک معلومات فراہم نہیں کرتیں، ان سے عام شخص بھی استفادہ کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جگہ جگہ دنیا کی معلوم دریافتوں کا حوالہ دیتے ہوئے ادبی اور تنقیدی پیرائے میں بات کرتے ہیں۔ دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور پیش رفتوں سے وہ ہمہ وقت باخبر رہتے ہیں۔ نئی سے نئی کتب کا مطالعہ ان کی عادتِ ثانیہ بن چکا تھا۔ مطالعے کے لیے وہ ادبی کتب کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے علوم سے استفادہ اور ہر مسئلے کو عالمی تناظر میں رکھ کر دیکھنے کے عادی ہیں۔ مزید ان کے تنقیدی مضامین سے ان گہرے تجربے اور مشاہدے کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھائیں تو وہ اس کے پس منظر سے آگاہ کیے بغیر قاری کے آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ اس کا ثبوت کی تنقیدی کتب اور مضامین سے مل جاتا ہے۔ مثلاً وہ ''اردو شاعری کا مزاج'' میں شاعری کا مزاج متعین کرنے سے پہلے اردو شاعری کا پس منظر بیان کرتے ہیں۔ اس کے کتاب کے پہلے باب میں انھوں نے انسانی تاریخ و تہذیب کو جدلیاتی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ طریقہ انھوں نے ''تصوراتِ عشق و خرد: اقبال کی نظر میں'' اور ''تنقید اور جدید اردو تنقید'' میں بھی اپنایا ہے۔ ان کی کتاب ''تخلیقی عمل'' میں بھی ''تاریخ کا تخلیقی عمل'' پر طویل بحث موجود ہے۔ تاریخی و سماجی پس منظر کے بغیر چیزوں کی تفہیم اور ان کا بیان وزیر آغا کی تحریروں میں ممکن نہیں۔ اس حوالے سے ان کا کہنا ہے:

''وہ تہذیب جو تغیر سے نا آشنا ہو، تاریخ سے بھی نا آشنا رہتی ہے۔ مگر تاریخ محض واقعات کا ڈھیر نہیں کیونکہ نہ صرف واقعات کا آپس میں منسلک اور مربوط ہونا ضروری ہے بلکہ ان کے پیچھے ایک ایسے تناظر کا ہونا بھی لازمی ہے جس کی نسبت سے ان واقعات کی پہچان ہو سکے ... یا وقت کی گزران کا احساس، تاریخی شعور کی اہم ترین شرط ہے۔ اسی طرح ان تہذیبوں پر بھی، جن پر فرد کی بہ نسبت سوسائٹی کا تسلط زیادہ مضبوط تھا، تاریخ کا شعور ایک خاص انداز کے تابع رہا۔''(۹)

تاریخی پس منظر کو بنیاد بنانا دراصل کسی بھی نظریے کو اس کی جڑوں سے جوڑ کر دیکھنے کے مترادف ہے۔ وزیر آغا کی تنقید کا مذکورہ پہلو اس وقت زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے جب وہ کسی فن پارے سے نتائج اخذ کرنے کے مرحلے سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ تنقیدی عمل کے دوران میں جب وہ کوئی سوال اٹھاتے ہیں تو اس کے جواب میں منطق اور استدلال لے کے سامنے آتے ہیں۔ یہ استدلال تاریخی اور ثقافتی پس منظر کو سمجھے بغیر آسان نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ہر قول اور

تصور کی توجیہہ بیان کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ ان کی سب سے نمایاں اور طاقت ور جہت ہے۔ توجیہاتی اور تجزیاتی انداز کو اپناتے ہوئے وہ فن پارے کا تجزیہ استقرائی انداز سے کرتے ہیں۔ اس حوالے سے بہترین نمونے ان کی کتاب ''نظمِ جدید کی کروٹیں'' میں موجود ہیں۔ اس کی ایک وجہ ان کا ولیم ایمپسن اور آئی اے رچرڈز سے متاثر ہونا ہے جو نظم کے تجزیاتی مطالعے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ جب وہ ''ادبی دنیا'' کے شریک مدیر مقرر ہوئے تو انھوں نے وہاں بھی یہی طریقہ کار رائج کیا۔ اس کے بعد ''اوراق'' میں بھی اس طرح کے تجزیاتی مطالعوں کو فروغ دیا۔

اردو ادب میں وزیر آغا کی کئی جہتیں ہیں۔ نقاد کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ درجے کے تخلیق کار بھی ہیں۔ ان کی تخلیقی قوت ان کے تنقیدی اور تحقیقی کاموں سے متاثر نہیں ہوئی بلکہ متعدد جگہوں پہ اُنھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ان کا تنقیدی کام ان کے تخلیقی عمل سے رس کشید کرتا ہے۔ ان کی تنقید کو بعض ناقدین تخلیقِ مقرر کا نام دیتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تنقید کو بھاری بھرکم الفاظ سے بوجھل نہیں ہونے دیا۔ تنقیدی خیالات کے ابلاغ کو سہل بنانے کے لیے انھوں نے شگفتہ اور مدلل انداز اختیار کیا جو ان کی تنقیدی تحریروں کو پراثر، دلچسپ اور فکر انگیز بنا دیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شاذیہ عمیر، تنقید اور وزیر آغا کی تنقید، (نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰ء)، ص ۹۲

۲۔ انور سدید، مکالمات ڈاکٹر وزیر آغا سے، (لاہور: مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۹۱ء)، مرتبہ، ص ۱۷

۳۔ وزیر آغا، تنقید اور جدید اردو تنقید، ص ۲۴۱

۴۔ محمد رفیع ازہر، وزیر آغا کے تنقیدی رویے، (لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۴۶

۵۔ انور سدید، مکالمات ڈاکٹر وزیر آغا سے، ص ۲۲۷

۶۔ وزیر آغا، تنقید اور جدید اُردو تنقید، ص ۹۱

۷۔ انور سدید، مکالمات ڈاکٹر وزیر آغا سے، ص ۲۲۷

۸۔ وزیر آغا، معنی اور تناظر، (لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۸۸

۹۔ وزیر آغا، تخلیقی عمل، (لاہور: ابلاغ پبلشرز، ۲۰۰۳ء)، ص ۸۹